Dialogue Social Science Review (DSSR)
www.thedssr.com

DIALOGUE SOCIAL SCIENCE REVIEW

ISSN Online: 3007-3154
ISSN Print: 3007-3146
Vol. 4 No. 2 (February) (2026)

Narration of Autobiography and Free-Flowing Thought in Urdu Novel

اردو ناول میں خود کلامی اور آزاد تلازمہ خیال کا بیانیہ

Dr. Uzma Noreen*
Lecturer Urdu Department G.C Women University Sialkot. Corresponding Author Email: Uzma.noreen@gcwus.edu.pk

Abstract
"Stream of Consciousness" plays an effective and influencing role in "Novel Nigari". This technique inspires readers towards the objectivity which the author wishes to convey. It reflects the images accordingly on the mirror of life. Thoughts, ideas and imaginations are oriented by this technique to streamline the other components of a novel. This trend has been adopted by Urdu novelist because of the western influence in literature. This technique i.e, "Stream of Consciousness" streamlines the thoughts of the readers and they pick the message of the author in an effective manner. When we talk about the novel "London ki aik Raat", we also see such waves of progressivism in this novel. Which Sajjad Zaheer had already pointed out. He said that Marx's philosophy of life and the influence of the Russian Revolution have also been influenced by Indian films. He said that escaping from the situation is not only literature, but the principle of literature is that whatever is happening on a global level should be considered and reflected on at every moment. Russia's desire was that the whole world should follow the Marxist system and the progressive movement was also its literary form. Narration of autobiography and free-flowing thought in this novel has been discussed here.
Keywords: Urdu Fiction, Novel, Stream Consciousness, "London ki aik Raat", Sajjad Zaheer, Narration of autobiography, free-flowing.

اردو ناول میں مختلف بیانیے اپنے وجود کے لحاظ سے اہم ہیں مگر بعض ناول نگاروں کے ہاں ایک تو بعض کے ہاں دوسرا اہم کا بیانیہ وقوع پذیر ہوتا ہے۔ یہاں ہم اردو ناول میں خود کلامی اور آزاد تلازمہ خیال کے لحاظ سے کچھ ناولوں کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔

"لندن کی ایک رات" ایک ایسا ناول ہے جو ۱۹۳۶ء میں لکھا گیا۔ اس کے مصنف سجاد ظہیر ہیں جو ترقی پسند تحریک کے بنیاد گزاروں میں شامل ہیں۔ اس ناول کی تکنیک میں شعور کی رو کی ذیلی خصوصیت خود کلامی سے بھرپور استفادہ لیا گیا ہے۔ مصنف کہتے ہیں کہ یہ ناول میں نے ۱۹۳۶ء میں لندن سے براستہ پیرس آتے ہوئے تحریر کیا۔ ناول کا موضوع بغرض تعلیم ہندستان گئے ہوئے نوجوان کی کیفیات کے بارے میں ہے، یہ دوسری جنگِ عظیم کا وقت تھا اور ہندوستان کے نوجوان خصوصاً امیر زادے اپنے آقاؤں کی سرزمین لندن جانے کے لیے وہاں کی فضاؤں میں جانے کے خواہش مند تھے۔ ویسے یہ صورتِ حال آج بھی اُسی طرح ہے کیوں کہ آج کا نوجوان بھی تعلیم کی بجائے یورپ جانے کا شائق ہے اور جلد سے جلد پیسہ کمانا چاہتا ہے۔ ہماری موجودہ نسل کا اپنے ملک سے محبت کا وہ جذبہ نہیں رہا جو چند دہائیاں پہلے تھا۔ وجہ یہی ہے کہ ملک پر چند مخصوص مافیاز اور خاندانوں کی حکومت ہے۔ (اگرچہ یہ صورت تیسری دنیا کے ہر ملک میں ہے اور اس کے پیچھے بھی سامراجی طاقتوں کی سوچ ہے)۔ غریب روزانہ غربت کے گڑھے میں پھنسا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ جوان ڈگریاں ہاتھوں میں لیے پھر رہے ہیں جب کہ امراء کے بچے انھی غریبوں کے ٹیکس پر پل رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا نوجوان ملک میں موجود نظام سے سخت نالاں ہے۔ یہاں تک کہ آج کا نوجوان ملک کے مستقبل پر ہی سوال اٹھا رہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ظلم کا یہ نظام کہاں تک چلے گا۔ جہاں سچ کو تلاش

Dialogue Social Science Review (DSSR)
www.thedssr.com

ISSN Online: 3007-3154
ISSN Print: 3007-3146
DIALOGUE SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol. 4 No. 2 (February) (2026)

کرنے والوں اور سوال کرنے والوں کے ساتھ ناگفتہ بہ سلوک ہوتا ہے۔ ہماری نئی نسل موجودہ نظام کے بارے میں سوچ کر پاگل ہو رہی ہے کہ جب ہم انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوئے اور اب تک ان کے چھوڑے ہوئے جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی غلامی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس سے بہتر ہے ک ہم ملک ہی چھوڑ جائیں، کیا فائدہ غلام ابن غلام ملک میں رہنے کا۔ ناول میں سات مختصر ابواب ہیں۔ اس طرح اس میں کل ملا کر پندرہ کردار ہیں جو اپنے ماجی، حال اور مستقبل کے منصوبوں پر عمل پیرا ہیں۔

"لندن کی ایک رات" کا آغاز شام چھ بجے سے ہوتا ہے اور اگلی صبح طلوعِ آفتاب پر ختم ہو جاتا ہے۔ شعور کی رو کی تکنیک کے حوالے سے یہ بات ذہن میں رہے کہ اس میں کردار اپنے ماضی کے واقعات سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ ناول میں موضوع اور ہئیت کے لحاظ سے ایک انفرادیت پائی جاتی ہے۔ "رات" لاشعور کی علامت ہے اور اس کی تاریکی شعور کی بندشوں کی کمزوریوں سے جڑی ہوئی ہے۔ کیوں کہ رات کی یہی تاریکی انسان کو عزم و ارادے سے نکال کر ناامیدی کی بیچارگی میں پہنچا دیتی ہے۔ اگرچہ رات کو انسان خواب دیکھتا ہے لیکن بعض خواب انسان کو ذہنی طور پر منتشر بھی کر دیتے ہیں۔

ناول کا اہم کردار اعظم ہے جو قنوطیت پسند اور شکی مزاج قسم کا جوان ہے۔ اس کا ذہنی تشکیک کا شکار ہے۔ وہ اپنے مسائل کی وجہ سے ہر وقت پریشانی کی حالت میں رہتا ہے۔ اگرچہ یہ نوجوان ہندوستان کے ایک زمین دار اور نوکر شاہی خاندان کا چشم وچراغ ہے۔ جیسا کہ اس قسم کے نوجوان اپنے مسائل کی وجہ سے فرسٹریشن کا شکار رہتے ہیں وہی حال اعظم کا بھی ہے۔ شیلا گرین اور جین نامی دو لڑکیاں بھی ہیں جن کے اپنے نفسیاتی مسائل ہیں۔ جین اعظم کے ساتھ فلرٹ کر رہی ہے جب کہ شیلا اپنے گم شدہ محبوب کی تلاش میں ہے۔ ان کے علاوہ کچھ مزدور بھی ہیں جو ہندوستان کے مسائل مسائل کو سمجھنے کی کوششوں میں مصروفِ عمل ہیں۔ ایک اور کردار ہے جو شراکت کا پرچار کرنے والا ایک معتدل مزاج جوان ہے۔ احسان کے خیالات غریب، مزدور اور کسانوں کے لیے یک گونہ ہمدردی ہے اور وہ سامراجی طاقتوں کا سخت مخالف ہے۔ اس طرح وہ دنیا جہاں کا حسن پرست اور مطالعہ کا شوقین ہے۔ چوں کہ وہ ترقی پسند تحریک کی شروعات کا زمانہ تھا اور مصنف کے دوستوں میں ملک راج آنند اور اقبال سنگھ بھی ان کے ساتھ شامل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ناول کے کرداروں میں سجاد ظہیر اور ان کے دوستوں کی جھلک بھی نمایاں ہے اور سب کردار اشتراکیت کا پرچار کرنے والے ہیں۔ دیگر کرداروں میں کریمہ بیگم ایک روایت پسند اور حاسد عورت ہے جب کہ عارف نامی کردار سول سروس کا شائق، خود پرست، مغرور اور انگریزی تہذیب کا متوالا جوان ہے اور اپنی محبوبہ شیلا کی یادوں کو دل سے لگائے ہوئے ہے۔ کریمہ بیگم کے کردار کے حوالے سے ناول سے یہ اقتباس پیش خدمت ہے:

> "وطن کی بھلائی کے لیے کوشاں ہیں؟ ذرا مجھے بتائیے تو سہی کون؟ راؤ نے تیزی سے پوچھا" کسی کو یہ تک معلوم نہیں کہ دیش کی بھلائی کس چڑیا کا نام۔ اس کے لیے کوشاں ہونا تو در کنار، زنانہ پن چرخہ کاتنے میں وطن کی بھلائی ہے؟ سرکاری ملازمت میں وطن کی بھلائی ہے؟ یا ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ میں کام کرنے میں ملک کی بھلائی ہے؟ ہر شخص کے پاس وطن کی بھلائی کا ایک نسخہ ہے۔"(۱)

ناول کا کردار عارف اپنے ماضی کی یادوں مین ہچکولے کھاتا رہتا ہے۔ اس کی سوچ یہ ہے کہ آئی سی ایس کا امتحان پاس کر کے اہندستان پر حکومت کرنے کا خواب پورا ہو جائے۔ اس طرح شیلا گرین میں دلچسپی لیتا ہے۔ اس کی دلچسپی دیکھ کر کریمہ بیگم کو برا لگتا ہے اور وہ شیلا سے کہتی ہے:

ISSN Online: 3007-3154
ISSN Print: 3007-3146
Vol. 4 No. 2 (February) (2026)

"کیا بن بن کر باتیں کرتی ہیں۔دیدہ دلیری سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چست کپڑے صرف اس لیے پہنے ہیں کہ مرد اس کے جسم کی بہار دیکھیں۔ بے شرم، بے غیرت، بے حیا،ایسی عورتوں میں اور زنان بازاری میں کیا فرق ہے چڑیل کی طرح بال بکھرے ہوئے منہ پر پاؤڈر لگا ہوا۔ لہنگے میں سے گز گز بھر ٹانگیں باہر نکلیں۔ جرابیں ریشمی، اتنی باریک کہ ان کا ہونا نہ ہونا برابر۔ کھڑی ہوں تو اکڑ کر چلیں تو سینہ تان کر، سگریٹ یہ پئیں، شراب یہ پئیں، ناچیں یہ، کون سا ہنر ہے جو ان میں نہیں۔ رہ گئی عصمت، آبرو، اسے تو یہ ہتھیلی پہ لیے پھرتی ہیں۔"(۲)

اوپر کے اقتباس سے کریمہ بیگم کی تنگ نظری کا اندازہ ہو جاتا ہے جو حاسد ہونے کے ساتھ ساتھ بدزبان بھی ہے۔حاسد انسان کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ جب بھی وہ اپنے سے بہتر انسان کو دیکھتا ہے تو وہ اول فول بکنے لگتا ہے۔ جیسا کہ اوپر کے اقتباس میں کریمہ بیگم کے تاثرات ہیں۔ ناول رومانی فضا میں سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ لندن کے شہر میں کو ایجوکیشن کا ماحول ہے جہاں مادر پدر آزادی ہے اور جنسی آزادی والا سماج ہے۔ ہم جنسی کو بڑی چیز سمجھتے ہیں مگر یورپ میں یہ ایک معمولی جذبہ ہے جو کسی بھی وقت سر جوڑ کر بول لیتا ہے اور پھر انسان اور وحشی کے درمیان فرق مٹ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ماحول میں جو وحشت ابھر کر سامنے آتی ہے وہ ہندوستانی نوجوانوں کے لیے خاصی حیران کن ہے۔

سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔اس وجہ سے انھوں نے ناول میں اپنے نظریات کا خوب پرچار کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی پسند کی فضا اور موضوعات پیش کیے ہیں۔ جیسا کہ تحریک آزادی کا جوش اور ولولہ، سماجی ناانصافی، اشتراکیت، سرمایہ دارانہ نظام کی نفی، انگریزوں کے خاص لوگوں سے عداوت وغیرہ۔ انھوں نے اس تحریک میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ اس وجہ سے ناول کے تقریباً تمام کردار اشتراکی سوچ اور رویوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ چوں کہ یہ زمانہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا تھا کیوں کہ یہ تحریک آتے ہی ہندوستان کی فضا میں چھا گئی۔ کیوں کہ ہندوستان سامراجی طاقت کے پنجوں میں پھڑ پھڑا رہا تھا ایسے میں اس تحریک نے ہندوستانی فضا کو تحریک دی اور یہ تحریک دیکھتے ہی دیکھتے مقبول ہو گئی۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ہندوستان میں جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام سے نفرت کی فضا پروان چڑھ رہی تھی اس لیے عام آدمی نے اس تحریک کو خوش دلی سے قبول کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ناول میں خارجی زندگی کو سمجھنے کے لیے آزاد تلازمہ خیال کے سکینر سے گزارا گیا ہے۔" لندن کی ایک رات" کا ہر کردار اپنے شعور اور لاشعور کے حوالے سے ہمیں اپنا دیدار کراتا ہے۔ کیوں کہ ان کے ظاہر و باطن ہمارے سامنے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ یعنی ناول کا بنیادی تھیم، افکار اور کردار سب ان کے شعور سے ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

ناول میں شعور کی رو کا بھرپور استعمال کیا گیا ہے۔ شعور کی رو میں تین اہم اجزا ہیں۔

۱۔ داخلی خود کلامی ۲۔ آزاد تلازمہ خیال اور ۳۔ راست ذہن کا اقتباس

یعنی داخلی خود کلامی کی وجہ سے کرداروں کے ذہن ہمارے سامنے آتے ہیں اور ہم ان کے ظاہر و باطن کے تمام پردوں میں جھانکنے لگتے ہیں۔ ان کرداروں کے احساسات ہمارے سامنے ایک ایک کر کے پیش کیے جاتے ہیں۔ان کرداروں کے منہ سے نکلے ہوئے جملے ان کی مخصوص ذہنیت کو سامنے لاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ناول نگار نے ان کی مخصوص ذہنیت کے مطلق مکالمے پیش کیے ہیں جو ایک کمال ہے اور ایسے لگتا ہے کہ یہ ساری فضا ان کی زندگی کا حصہ ہے۔ یعنی ان کی آپ بیتی نما محسوس ہوتا ہے۔ ان کرداروں کے ذہن میں جو ڈرامائی کیفیت ہمیں

نظر آتی ہے اس سے ہم ان کے احساسات کو مکمل طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ جہاں تک آزاد تلازمہ خیال کی بات ہے تو یہ خلط خیالات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہوتا ہے۔ اس طرح کرداروں کی مجموعی نفسیات سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ اس حوالے سے راؤ اور نعیم کے کرداروں کے بارے میں ہم پوری طرح باخبر ہو جاتے ہیں۔ مثلاً شراب خانے میں اعظم مزدوروں سے گفتگو کے دوران مختلف قسم کے خیالات کی رو میں ہوتا ہے۔ اس طرح راؤ، احسان، عارف کے خیالات کی کیفیات سے خود کلامی کا سا سماں سامنے آتا ہے۔ اس طرح ان کرداروں کے ذریعے کہلوائے گئے مکالمے بھی ہمیں ان کے خیالات سے آشنا کراتے ہیں۔ جیسے اوپر بیان کیے گئے پہلے نمبر کے مکالمے میں راؤ نے گاندھی جی کی ٹھنڈی سیاست پر طنز کیا ہے۔ جب کہ نیچے کے اقتباس میں شیلا گرین کے بارے میں کریمہ بیگم کے حسد اور جلن والے خیالات ملاحظہ ہوں:

> "نہ معلوم جین کتنے ہندوستانیوں کو خراب کر چکی ہو گی۔ چلتر باز! لیکن آخر ان (ہندستانی) لڑکوں کو عقل پر کیوں پردے پڑ گئے ہیں۔ بہت پڑھی لکھی بھی تو نہیں معلوم ہوتی۔ سینہ سپاٹ، پھیکا رنگ، صورت پر تو پھٹکار رہتی ہے۔ جسم مردوں کا سا۔ یہ عورت ہے یا پہلوان۔ ایک بھی بات تو اس میں شریف زادیوں کی سی نہیں۔ پنچ خاندان کی ہو گی۔ کسی مزدور اٹھائی گیوے کی لڑکی۔ انگریز اسے پوچھتے نہ ہوں گے۔ ایسی ایسی کئی لڑکیوں کو یہاں شوہر دستیاب نہیں ہوتے۔ سب جوتیاں چٹخاتی پھرتی ہیں۔ چلتی ہوئی عورت ہے۔ کسی بھولے بھالے شریف ہندوستانی امیر زادے کو پھانس کر اس سے شادی کی فکر میں ہو گی۔" (۳)

اوپر کے اقتباس سے یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ کریمہ بیگم حسد کی وجہ سے جل بھن رہی ہے اور شیلا کے بارے میں مسلسل منفی خیالات کے اظہار سے نہیں ہچکچاتی۔ اس کے بولنے کا انداز بھی شعور کی رو کا ہے۔ اس حوالے سے ناول سے ایک اور اقتباس پیش خدمت ہے جس سے ناول کی معنویت دوچند ہو جاتی ہے:

> "ہم ان کو راستے کی طرف آنے میں مدد دیں جدھر زندگی کی روشنی ہے۔ جدھر ہر بے ہودہ بے حسی کا نام خوشی ہے۔ بلکہ جدھر مسرت کا ایک نیا احساس ہے۔ قدرت کی اندھی طاقتوں کو زیر کرنے کی مسرت، انسانوں کو بے شعوری، بد نظمی اور خود غرضی کی بربریت سے نکال کر ایک مصلح، مہذب اور متمدن دنیا بنانے کی مسرت، کام کی مسرت، محنت اور مشقت کی مسرت۔" (۴)

اوپر کے اقتباس میں "مسرت" کی تکرار جملوں میں ترنم اور موسیقت کا احساس دلاتی ہے اور اس طرح ایک غنائی اقتباس بن جاتا ہے۔ ناول میں آزاد تلازمہ خیال کے حوالے سے انسانوں کی کیفیات، ذہنی رویوں اور داخلی و خارجی زندگی کی عکاسی کے حوالے سے درجہ ذیل سطریں اہم ہیں:

> "بڑے بڑے راجاؤں، نوابوں اور رئیسوں کو لے لو۔ ان کی ذات سے کسی کو کیا فائدہ پہنچا؟ دماغ کی جگہ ان کے سر میں گوبر بھرا ہوا ہے۔ صرف جو ایک کام جوان کو خوب آتا ہے، ملک فروشی ہے۔۔۔ وکیل بیرسٹر ہوا ایسے لوگ جو سرکاری نوکر ہیں یا بڑے پونجی پتی مہاجن، سرمایہ دار۔۔۔ سرکاری نوکر تو اپنے افسر کے سامنے ایسا مسکین بنا رہتا ہے جیسے اپنے مالک کے سامنے دم دبائے ہوئے کتا ہو۔ اور اپنے نیچے والوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا ہے جس میں انسانیت کہیں چھو بھی نہیں جاتی۔" (۵)

Dialogue Social Science Review (DSSR)
www.thedssr.com

ISSN Online: 3007-3154
ISSN Print: 3007-3146
Vol. 4 No. 2 (February) (2026)

ناول میں منظر نگاری اپنے جوبن پر نظر آتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ لندن کی خوب صورتی تو پوری دنیا میں اپنی مثال آپ ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہاں رہنے والی قوم اس لحاظ سے دنیا کی مہذب ترین قوم ہے کہ ان کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں۔ وہاں کے شہری خود ہی اپنے شہر کا خیال رکھتے ہیں۔ یہ صرف لندن میں نہیں بلکہ ایشیائی اور افریقی ممالک کے علاوہ باقی ساری دنیا کی اقوام باشعور ہیں۔ بس ہمارا تو باوا آدم ہی بگڑا ہوا ہے اور ہم اس پہ بھی بس نہیں کرتے بلکہ بگڑتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے پوری دنیا میں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔

"لندن کی ایک رات" سے منظر نگاری کے حوالے سے یہ اقتباس قابل تعریف ہے:

> "اس پہاڑ کے جہاں تک نظر کام کرتی تھی، کوہستانی علاقہ تھا۔ قطار اندر قطار دور تک سر بفلک چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ افق کی حد تک پہنچ کر ہلکے سے نیلے غبار میں چھپا ہوا برفستان کا سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ یہاں دھوپ کی چمک اور سایہ برف کی سفیدی اور آسمان کی نیلاہٹ سب ایک دوسرے سے مل جل کر آنکھوں کے سامنے رنگ، روشنی اور تاریکی، عظمت اور بلندی ایک مکمل تصویر کھینچ رہے تھے۔"(۶)

کردار نگاری کے حوالے سے بھی اس ناول میں کئی خوب صورت اقتباس موجود ہیں جن سے شخصیت کے حوالے سے مکمل آگاہی مل جاتی ہے۔ مثلاً ذیل کے اقتباس میں شخصیتی خاکہ اس طرح اجاگر کیا جاتا ہے:

> "مزدور نے اپنا پائپ سلگانا شروع کیا۔ جلی ہوئی دیا سلائی کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی۔ وہ میسن آدمی تھا۔ چالیس پینتالیس برس کا۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں جو اس کے لبوں تک پہنچتی تھیں اور جن کے کنارے بئیر سے نم تھے۔ گہرا گلابی رنگ، ناک کچھ پھولی ہوئی سی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں مگر ان میں تیزی، بھویں ہلکی بھوری، میانہ قد، فربہ جسم، ہاتھوں کی موٹی موٹی انگلیاں، اس شخص کے کپڑے پرانے گہرے بادامی رنگ کے بالکل چھنا ہو گئے تھے۔ پتلون پر گھٹنے کے نزدیک پیوند۔"(۷)

اوپر میسن کی شخصیت کا ایسا نقشہ پیش کیا گیا ہے جیسے ایک نقاش تصویر بنا رہا ہو اور اس کے نقوش کے پر چھوٹے بڑے زاویے اس کی نظر میں ہوں۔ ایسی باکمال تصویر کاری ہر ناول نگار کے بس کی بات نہیں ہوتی۔۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سجاد ظہیر کی تصویر کاری کمال کی ہے۔ موضوع کے ساتھ دیانت داری برتنے کی یہی تو خوبی ہے کہ اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا جائے۔ وجہ یہ ہے کہ اس ناول کی کہانی صرف ایک رات کی ہے مگر شعور کی رو کے ذریعے سے صرف ایک رات کو پورے ناول کا موضوع بنا کر باکمال مرصع نگاری کی گئی جو سجاد ظہیر ہی کر سکتے ہیں۔ ساتھ ساتھ انھوں نے ہر کردار کے ظاہر و باطن کے حوالے سے ان کے احساسات کو ایسے پیرائے میں بیان کیا ہے کہ قاری داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

سجاد ظہیر کے اس ناول کا اسلوب تکرار لفظی کے حوالے سے خاص الخاص ہے کیوں کہ تراکیب اور صوتی آوازوں نے ایک خاص آہنگ پیدا کیا ہوا ہے۔

"طفل کی آواز، رونے کی آواز، نغمے کی آواز، لڑکی کے بولنے کی آواز مجھے کیوں پسند ہے۔"

اس طرح جملوں کو بدل کر ساخت دہرانے کا عمل بھی قابل توجہ ہے۔

"بغیر یہ بتلائے کہ اس کا "اسم شریف" کیا ہے۔ "دولت خانہ" کہاں ہے؟ اس کا پیشہ کیا ہے؟ اس کی تنخواہ کیا ہے؟ اس کا مذہب کیا ہے؟ اس کی ذات کون سی ہے؟"

Dialogue Social Science Review (DSSR)
www.thedssr.com

ISSN Online: 3007-3154
ISSN Print: 3007-3146
Vol. 4 No. 2 (February) (2026)

ضمائر کے استعمال کی اکثر مثالیں "لندن کی ایک رات" میں موجود ہیں۔

۱۔ اس کی نظر کے آگے کے شعلوں پر جمی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ اڑ گئی۔ وہ کرسی پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ایک لمحے کے لیے رک کر اس نے کہا۔(واحد غائب)

۲۔ چلی جا میرے پاس سے اگر مجھ سے محبت نہیں تو کیوں میرے پاس آتی ہے۔ کوئی اور ڈھونڈ۔ تیرے اور بہت سے طلب گار ہیں۔ میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں۔(واحد متکلم، حاضر اور غائب)

۳۔ میں ہوں ڈارلنگ، میرے پیارے، تم مجھ سے خفا ہو۔ تمہاری آواز سے معلوم ہوتا ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ مگر میرا قصور نہیں۔(واحد متکلم اور حاضر)

۴۔ پھر آخر مجھ میں کون سی کمی ہے؟ میرے دوست خیال کرتے ہیں کہ مجھے ان باتوں سے دلچسپی ہی نہیں۔ اچھی صورت دیکھ کر مجھ پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔"(واحد متکلم)

طویل جملوں میں ایک ہی قبیل کے الفاظ کی ماہرانہ بناوٹ کی مثالیں ذیل میں دی گئی ہیں۔

۱۔ مجھے ہر پریشانی، کوفت، الجھن، بے اطمینانی، حسد، غصہ، رنج اس کی وجہ سے ہوتا ہے۔

۲۔ راؤ نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر مردنی چھائی ہوئی تھی جیسے کوئی سحر زدہ جانور، اذیت، بے بسی، دہشت لاچاری۔۔۔"

غرض "لندن کی ایک رات" ایک ایسا شاہ کار ہے جس میں ہمیں شعور کی رو کے حوالے سے خود کلامی کا سا انداز ملتا ہے اور ساتھ ساتھ آزاد تلازمہ خیال کی صورتیں بھی سامنے آتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۶۵

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً، ص ۷۲

۴۔ ایضاً، ص ۷۸

۵۔ ایضاً، ص ۸۸

۶۔ ایضاً، ص ۱۰۰

۷۔ ایضاً، ص ۹۶

۸۔ ایضاً، ص ۶۳